بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ آغاز

اسلام میں قرآن کریم کے بعد دوسرا مقام سنت اور حدیث نبویؐ کا ہے۔ قرآنِ کریم اوّل تا آخر سنتِ نبویؐ کی اس اہم ترین مرکزی اور بنیادی حیثیت پر زور دیتا ہے۔ وہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو ایک ایسے رسول کی حیثیت سے ہمارے سامنے پیش کرتا ہے، جو بیک وقت معلّم اور مربّی بھی ہیں، شارح کتاب اللہ بھی اور تمام امت کے لئے پیشوا اور نمونۂ تقلید بھی۔ وہ رسولؐ کی اتباع اور اطاعت کو محبتِ خداوندی اور یومِ آخرت کی امیدواری کی علامت قرار دیتا ہے، اور حضورؐ کی زندگی اور آپ کے اقوال و افعال کو اپنا اسوہ حسنہ نہ بنانے والوں کو کافرین کے زمرہ میں شمار کراتا ہے۔ اسکی بیشمار آیتیں ناطق ہیں۔ کہ رسول کا کام صرف "کتاب" پہنچانا نہیں بلکہ اسکی تشریح و تعبیر اور اسکی تفسیر و تبیین بھی آپ کے فریضۂ نبوت میں شامل اور منصبِ رسالت کا تقاضا ہے۔ وہ جگہ جگہ رسول کو بحیثیت شارع پیش کرکے انہیں تشریعی اختیارات (LEGISLATIVE POWERS) دیتا ہے اور کبھی مختلف پیرایوں میں تصریح کرتا ہے کہ رسولِ کریم اللہ کے مقرر کئے ہوئے حاکم، فرمانروا اور قاضی (جج) ہیں — وہ خدائے بزرگ و برتر کی قسم کھاکر اعلان کرتا ہے کہ تیرے رب کی قسم جب تک یہ لوگ دل و جان سے تیرے فیصلوں کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کردیں یہ ہرگز ہرگز مؤمن نہیں ہوسکتے۔ تیری مرضی اور فیصلہ سے انکار تو کیا، اگر انہیں اپنے دلوں میں ذرا سی تنگی بھی محسوس ہوجائے تو یہ چیز متاعِ ایمان کے ضیاع اور دین و اسلام کی بربادی کا سبب ہوگی۔ مومنین کا شیوہ تو یہ ہے کہ جب اللہ اور رسول کی کسی بات اور فیصلہ کیطرف بلائے جائیں تو وہ دوڑتے چلے آئیں۔ اور کہیں کہ ہم نے سن لیا اور ہم نے مان لیا۔ (النور۔ ۵۱) رہے کفار اور منافقین، تو ان کا حال یہ ہے کہ ایسے موقع پر رسول سے کنّی کتراتے ہیں۔ (النساء۔ ۶) وہی قرآن جسکی آڑ لیکر آج دین اور ملتِ اسلامیہ پر شبخون کرنیوالے یلغار کر رہے ہیں، اُسی کتابِ مبین کا اعلان ہے کہ رسولؐ کی اطاعت خدا کی اطاعت اور اس کے تشریعی منصب سے انکار خدا اور اسکی کتاب سے انکار ہے۔ وہی کتاب کہتی ہے کہ رسولؐ کی زبان خدا کی زبان۔ اس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ اس کا قول خدا کی وحی اس کا عمل خدا کا منشاء اور اس کا فیصلہ خدائے بزرگ و برتر کا اٹل قانون ہوتا ہے۔

پھر آہ! ان لوگوں کی نفسانی خباثتوں اور فطری کج فہمیوں کا ماتم کن الفاظ سے کیا جائے جو

قرآن کا نام لیکر رسولؐ اولین و آخرین سے یہ سارے مناصب (خاکم بدہن) چھین لینا چاہتے ہیں کہ "جو کچھ ہے کتاب اللہ میں ہے، رسولؐ کی اپنی حیثیت کچھ بھی نہیں، نہ اس کے ارشادات اور تشریحاتِ قرآن کو شریعت کا حصہ قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ انہیں مسلمانوں کے قانون کا ماخذ سمجھا جاسکتا ہے"۔ حالانکہ سنت کا دوسرا ماخذِ قانون (SOURCE OF LAW) ہونے پر صحابہ کرام سے لیکر آج تک امت مسلمہ کا اجماع چلا آرہا ہے۔ مگر اسلام میں سنت کو جتنا اہم کردار اور اساسی حیثیت دی گئی ہے، اسلام اور رسولِ اسلام کی ذاتِ اقدسؐ سے عناد رکھنے والے منافقین اور ملحدین نے سنت کی تشریعی حیثیت گھٹانے میں اتنا ہی زور لگایا ہے کہ جب رسولؐ کی تشریح اور تفسیر کو قرآنِ کریم کے احکام اور اصطلاحات سے الگ کر دیا جائے گا، تو اسلام اور قرآن کی من مانی تاویل بلکہ تحریف کے لئے راستہ کھل جائے گا۔ قرامطہ، باطنیہ، معتزلہ، خوارج اور اسطرح کے بیشمار فرقِ باطلہ میں یہ چیز آپ کو قدرِ مشترک کے طور پر ملے گی، خواہ یہ لوگ دعوٰی حدیث پر عمل کرنے کا کرتے رہے یا علانیہ انکار۔

پچھلی دو صدیوں سے یورپ کے مستشرقین اور مسلمانوں کے تجدّد زدہ طبقوں کے مساعی کا محور بھی زیادہ تر "سنتِ رسول" ہی رہا کبھی کھلے الفاظ میں اسے نشانۂ تحقیق بنایا گیا اور کبھی منافقانہ لبادہ اوڑھ کر سنت کی نئی نئی تعبیرات کرنے کی شکل میں ہمارے ہاں کے تجدّد زدہ حضرات جو نہ تو اپنی علمی و فکری قوتوں کو خدا و رسولؐ کی مرضیات پر چھوڑ دینا چاہتے ہیں اور نہ مجبوری اور مصلحتوں کی وجہ سے واضح طور پر اسلام اور ایمان سے انکار کر سکتے ہیں۔ ان کے مساعی کا تعلق بھی زیادہ تر سنتِ رسولؐ کی تشریعی حیثیت کو نقصان پہنچانے سے ہے۔ ایسے لوگ جن کی ساری علمی متاع اپنے پیشرو غیر مسلم مغربی اساتذہ کی تحقیق در یسرچ ہے، ہمیشہ سنتِ نبویؐ کے مصداق پھر اسکی اہمیت اور استنادی حیثیت کو مجروح اور مشکوک کرنے کے درپے رہتے ہیں۔ ان لوگوں میں سے غلام احمد پرویز اور اسکی جماعت تو کھلے بندوں احادیثِ رسولؐ سے انکار کی دعوت دیتی ہے۔ اور کچھ لوگ علانیہ انکار کئے بغیر سنت اور حدیث کو اپنی ملحدانہ اغراض کی بناء پر ایسے معانی پہنانا چاہتے ہیں جس سے سنت کی حقیقت تو مسخ ہو کر رہ جائے، مگر انکارِ حدیث کے الزام سے بھی ان کا دامن بچ جائے۔ اس "طرزِ تحقیق" کا سہرا رسوائے عالم یہودی مستشرق پروفیسر جوزف شاخت کے سر پر ہے۔ اور ہمارے ہاں اس نظریہ کے فروغ و اشاعت کا فریضہ ان کے وفا شعار شاگرد ڈاکٹر فضل الرحمان اور ان کی ہمنوا جماعت بجا لا رہی ہے۔ پہلی جماعت اپنی فاسد اغراض اور خواہشات

کی راہ میں سنتِ رسول کو سنگِ گراں سمجھ کر اسے راستہ ہی سے ہٹا دینا چاہتی ہے ۔ مگر ڈاکٹر فضل الرحمٰن کا نظریہ "سنتِ جاریہ وغیر جاریہ" وہ عیارانہ حربہ ہے جسے ہاتھ میں لیکر آپ ہر قسم کی رندی اور عیاری پر تقویٰ اور پارسائی کا غلاف چڑھا سکیں گے ۔ اس نظریہ کا خلاصہ فضل الرحمان صاحب کے الفاظ ہی میں یہ ہے کہ "سنت درحقیقت ایک تعامل اصطلاح" ہے ۔ جسکی تشکیل "آزاد شخصی رائے" سے ہوتی ہے ۔ اور "عوام الناس" یا "رائے عامہ" کے قبول کر لینے کے بعد وہی چیز "سنت" بن جاتی ہے اور رائے عامہ کے اس قبول کر لینے کا نام ہی "اجماع" ہے ۔ جسکو وہ "آزاد اجماع" کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔ ان کی تحقیق کے مطابق امت مجموعی طور پر سنت نبویؐ کے مشمولات کی تخلیق کرنے کی مستحق ہے ۔ امت الفاظ پر زور نہیں دیتی بلکہ اسکی روح کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہے[۱] ۔ اور اس "تعاملی اصطلاح کو جاری رکھنے کے لئے ڈاکٹر صاحب موصوف اس کا نام سنتِ جاریہ (زندہ سنت) رکھتے ہیں اور حضورؐ کی اصلی سنت کو سنتِ غیر جاریہ (مردہ سنت ۔ معاذ اللہ) قرار دیتے ہیں ۔ جسکی تشریح مختصراً یہ ہے کہ کتاب و سنت اور تعلیمات شریعت میں اتنی "توسیع" کر دی جائے کہ جدید تہذیب و تمدن کے پیدا کردہ تمام مسائل اور خرابیاں عامۃ الناس کی رائے اور تعامل کی وجہ سے حسبِ خواہش سنت اور شریعت میں سمائے جا سکیں ۔

تحریف و تلبیس اور دین کی بنیادوں میں رخنہ اندازی کے لحاظ سے چودھویں صدی کی یہ تحقیق منکرین حدیث کے پہلے گروہ سے زیادہ مہلک اور خطرناک ہے ، تعجب ہے کہ بعض سادہ لوح حضرات کی نظریں لاعلمی یا دینی بے حمیتی کی وجہ سے فضل الرحمان کی اس تکنیک پر نہیں جاتیں اور وہ "انکار حدیث" سے دوسری جماعت کی برأت کرنا چاہتے ہیں ۔ حالانکہ فضل الرحمان یا اس کے ادارہ کیطرف سے اگر "پرویزی نظریہ" کے تعاقب میں کوئی مضمون آتا ہے تو وہ صرف اس وجہ سے کہ انہیں پرویزی اندازِ فکر مسلمانوں کے دینی احساسات اور جذبات کی وجہ سے اسلام کے حق میں کم خطرناک معلوم ہوتا ہے ۔ جبکہ یہ لوگ قصرِ اسلام کو خاکم بدہن جلد از جلد پیوندِ خاک دیکھنا چاہتے ہیں (ولا یفعل اللہ کذلک) یہ لوگ اپنے مقصد کے لئے چور اور منافق بن کر درپردہ حیلوں سے اس قصر میں نقب زنی کو زیادہ مؤثر اور مفید سمجھتے ہیں ۔ پرویز جیسا جارحانہ اور دو ٹوک طریقہ نہیں ۔ اگر پرویزی جماعت کھلے ارتداد اور کفرِ صریح کا راستہ چھوڑ کر ان کی

۱۔ مذکورہ بالا نظریہ کی تفصیلات کے لئے ملاحظہ فرمائیے ماہنامہ فکر و نظر جولائی ، اگست ۱۹۶۳ء مقالہ تصورِ سنت اور دیگر مضامین ۔

طرح نفاق اور تلبیس کا راستہ اختیار کرے تو آج ہی یہ دونوں مکتبِ فکر گلے مل سکتے ہیں۔ پھر ان دونوں مکاتبِ فکر میں میدان الحاد و تجدد کی سیادت و قیادت کا جذبہ بھی کارفرما ہے جو انہیں ایک دوسرے کا رقیب اور حریف بنانے پر مجبور کرتا رہتا ہے۔ ورنہ فرقِ باطلہ کے نفسیاتی مطالعہ اور ارشاداتِ نبوی کی روشنی میں اصل اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں سب ایک ہیں۔ طریقِ کار، اندازِ بیان اور تعبیرات میں فرق ہے۔

چودھویں صدی کے اباحیت زدہ لوگوں کو اسلامی اقدار سے فرار کے لئے مستشرقینِ یورپ، ہمارے ہاں کے اہلِ تجدد اور اسلام کے تعمیرِ نو (NEW CONSTRUCTION) کا نعرہ لگانے والوں اور اس کو حالات اور ظروف کا تابع بنانے والوں کی یہ تحقیق خوب بھائی ہے کہ ہوس زدہ عوام کی اکثریت اور دین سے عموماً بے خبر عامۃ الناس کی خواہشات اور فیصلوں کو دین میں سنتِ جاریہ، آزاد اجماع، شخصی اجتہاد وغیرہ کے نام سے حجت اور اتھارٹی کا مقام دے دو۔ پھر دیکھو کہ جو فواحش اور منکرات دین میں قطعی حرام تھے، کسطرح وہ یکایک عامۃ الناس کے اپنانے سے جائز اور حلال بلکہ قانون اور شریعت کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ اگر اس "آزاد اجماع" اور "شخصی رائے" کو احکامِ شرعیہ کا ماخذ اور "سنتِ جاریہ" مان لیا جائے تو پھر کون ہے جو سینما بے پردگی، مخاشی، سود بنکنگ جوا الغرض یورپ کے تمام اخلاقی معاشرتی اور اقتصادی مسائل کو اسلام سے مخالف کہہ سکے۔ کل اگر آزاد شخصی رائے سے تشکیل پائی ہوئی "سنتِ جاریہ" سوشلزم کو پسند کرے، پرسوں کمیونزم یا کیپٹل ازم کو اور کچھ عرصہ بعد دجال اور اسکی لائی ہوئی یورپی تہذیب کو گلے لگائے تو ان میں سے ہر چیز کو سنتِ نبویؐ کا مقام حاصل ہو جائے گا۔ والعیاذ باللہ ذرا اور گہرائی میں جائیے تو نتیجہ کے لحاظ سے "سنت اور حدیث" سے تلاعب اور تمسخر کرنے والی دونوں جماعتیں اس نکتہ پر اکٹھی ہو جاتی ہیں کہ "اطاعتِ رسول" اور شریعت کی بجائے ہر دور کے عوام کے فیصلوں کو ہی حیثیت دیدو جو رسول اور اسکی سنت کو حاصل ہے۔ البتہ پرویزی مکتبِ فکر میں اسکی تعبیر "مرکزِ ملت" کے نام سے کی جاتی ہے اور متجددین کے ہاں "زندہ اور مردہ سنت" سے اور کبھی آزاد اجماع اور "اجتہاد" کی آڑ میں عوام یا ان کی منتخب کردہ پارلیمنٹ (مقننہ۔ اگر اسے اسلامی نقطۂ نظر سے مقننہ کہنا جائز بھی ہو) کو ہر قسم کے فیصلوں کا حق دیا جاتا ہے۔ خواہ ان فیصلوں کا مقصد کتاب و سنت اور اس کے منصوص احکام کو "ویٹو" کرنا ہی کیوں

نہ ہو۔ اور اس خود ساختہ اجماع سے امت کے پچھلے تمام اجماعی مسائل کا توڑ کیوں نہ ہو رہا ہو۔

پھر اس غلط اور خطرناک تصورِ اجماع کا پروپیگنڈا اس زور شور سے کیا گیا ہے کہ بدقسمتی سے اور تو اور ہمارے قابلِ احترام صدرِ مملکت تک اس نظریہ سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اپنی کتاب "فرینڈز ناٹ ماسٹرز" کے گیارھویں باب۔ آئین اور نظریہ حیات " میں انہوں نے " اجماع " کے اسی مفہوم کو اپنا لائحہ عمل بنانا چاہا ہے۔ اور چونکہ ملکی آئین اور ضابطۂ حیات کی تشکیل میں صدرِ محترم کو اہم ترین مقام حاصل ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ انہی خطوط پر وہ ملک کی قانون سازی کو پسندیدہ سمجھتے تھے جس کے اثرات سے مستقبل میں پورے ملک کے مسلمان اکثریت کا متاثر ہونا لازمی تھا۔ اجماع کا وہ تصور جو اسلاف نے کتاب و سنت کی روشنی میں ہمیں دیا ظاہر ہے کہ اس کے لئے جو اہلیت اور صلاحیت ملحوظ رکھی گئی تھی، عوام تو کیا اس دور کے خواصِ امت تک میں اس کا پایا جانا مشکل ہے۔ صدرِ محترم کے خیال میں ایسے اجماع سے جمہوری قدروں کی پامالی ہوتی ہے۔ اس لئے وہ قانون و شریعت پر علماء یا دینی علوم سے وابستہ کسی خاص گروہ کی اجارہ داری ناجائز سمجھتے ہیں اور زمانۂ جدید میں اجماع کا مصداق قانون ساز اداروں کی رائے ہی کو قرار دیتے ہیں۔

حالانکہ ظاہر ہے کہ اسلام میں "علماء اور ملّا" کسی خاص رنگ و نسل یا کسی مخصوص پیشہ یا کسی خاص قوم و نسب سے نسبت رکھنے والی جماعت کا نام نہیں، نہ اسلام میں اس پاپائیت اور برہمنیت کی گنجائش ہے۔ بلکہ مسلمانوں کے ہر طبقہ میں سے جو بھی چاہے بلا امتیاز رنگ و نسل اور بلا تفریق قوم و پیشہ، کتاب و سنت اور اسلامی علوم کا صحیح علم و فہم حاصل کرکے عالم بن کر منصبِ وراثتِ نبوت پر فائز ہو سکتا ہے۔ رنگ و نسل کا امتیاز تو کیا دین کی ترجمانی کا یہ منصبِ جلیل مسلمانوں کی عورتوں اور غلاموں تک کو نصیب ہو سکتا ہے۔ تو پھر اصل معاملہ "ملا" کی اجارہ داری کا کب رہ جاتا ہے۔؟ اس صورت میں اگر ہم "ملا" کا نام لے کر دین کی اجارہ داری اور تعبیر و ترجمانی میں اپنے آپ کو شریک کرنا چاہیں تو درحقیقت ہم تشریع اور قانون سازی کے لئے کتاب و سنت کی بالادستی اور اجارہ داری کے روادار نہیں ہوں گے ـــ بیشک اسلام نے جمہورِ امت اور مسلمانوں کے عمومی پسند اور انتخاب کی اہمیت تسلیم کی ہے۔ یہاں تک کہ اسے اجماع، استحسان، عرف، اور تعاملِ امت کے نام سے اسلامی قانون کا ایک اہم رکن قرار دیا گیا ہے۔ مگر اس کے ساتھ اس

نے یہ بھی لازم کر دیا ہے کہ جمہور کا کوئی فیصلہ نہ تو کتاب و سنت اور خدا و رسول کی مرضی اور دین کے عمومی مزاج سے متصادم ہو اور نہ کسی چیز کو اپنانے میں خواہش پرستی، نفس پروری اور دین سے گریز کا داعیہ شامل ہو۔ جمہوریت کے نام سے دین اور شریعت میں عوام کو اسطرح کی آزاد قانون سازی کا حق دینا بالکل ایسا ہی ہے کہ ہم ملک کی تعمیری اور ترقیاتی منصوبوں میں کسی انجینئر کی رائے اور قابلیت سے استفادہ کی بجائے عام لوگوں کو جنہیں انجینئرنگ کی معمولی شد بد بھی نہ ہو سارا کام سپرد کر دیں، کسی قابلیت اور صلاحیت کے بغیر عوام کو تربیلہ اور منگلا جیسے بھاری بھرکم منصوبوں کی تعمیر و تشکیل کا کام سپرد کر دینا جمہوریت پروری نہیں بلکہ جمہور اور جمہوری اقدار سے دشمنی ہو گی۔ اسی طرح ڈاکٹری اور میڈیکل کو لیجئے، لوگوں کی صحت، بیماری اور خصوصاً اجسامِ انسانی کی چیر پھاڑ جیسا نازک کام عوام کے سپرد نہیں کیا جا سکتا۔ کیا ملک کے ہر شخص کو جان بلب مریضوں کے اپریشن کا حق اس لئے دیا جا سکتا ہے کہ اسے منع کرنا جمہوریت کی پائمالی ہو گی۔؟ نہیں؛ بلکہ میڈیکل کا نازک ترین کام وہی شخص انجام دے سکے گا جسے مطلوبہ قابلیت، تعلیم، ڈگری اور تجربہ پورے طور پر حاصل ہو۔۔۔ اور کیا ملک کے ہر شہری کو خواہ وہ مروّجہ عدالتی قوانین اور عدالتی نظام سے معمولی آگاہی بھی نہ رکھتا ہو یہ حق دیا جا سکے گا کہ وہ چیف جسٹس یا پورے عدلیہ کے فیصلوں کو چیلنج دے سکے، یا قتل جیسے مقدموں کا فیصلہ کرتا پھرے، یا اُسے وکالت کا اختیار دیا جائے۔۔۔ پس ظاہر ہے کہ جب دنیاوی علوم میں اس قسم کی اجارہ داری کو ہم جمہور کی حق تلفی قرار نہیں دے سکتے تو دین، شریعت، اور زندگی پر لاگو ہونے والے قوانین کے لئے مخصوص شرائط قیودات اور خاص قسم کی قابلیت اور اہلیت کے التزام کو کیوں جمہوری اقدار کی خلاف ورزی سمجھا جائے؟

پس بلاشبہ شریعت نے ہر کس و ناکس کو نہ تو اجتہاد کا حق دیا ہے نہ شخصی رائے پر اٹھائے گئے آزاد اجماع کو وہ دین کا اصل قرار دیتا ہے۔ بلکہ اجماع ایسے لوگوں کا ہی معتبر ہو گا جو خدا ترسی، تقویٰ، خشیت، فراستِ ایمانی، بصیرتِ دینی، جذبۂ خیر خواہی و حق کوشی جیسی صفات سے مالامال ہوں، علمی اور فنی لحاظ سے ہر طرح کامل مکمل جامع اور عبقری شخصیتیں ہوں۔ ان کا کوئی فیصلہ تعصب، تحزب، عناد، جہل، خود غرضی اور خواہشاتِ نفسانی پر مبنی نہ ہو اور پھر ان کے فیصلوں کے لئے اللہ، رسول اور عہدِ صحابہ و تابعین سے کوئی قوی "سند" بھی موجود ہو۔۔۔ ایسے ہی لوگ، اجتہاد و استنباط کے اہل ہوں گے اور ایسے ہی تمام بزرگوں کا اتفاق "اجماع"

قرار پاسکے گا۔ ممکن تھا کہ آج بھی ان شرائط اور قابلیتوں کے ساتھ اجتہاد کا دروازہ کھولا جاسکتا مگر افسوس! کہ واقعاتی دنیا میں صدیاں ہوئیں وہ کنجی گم ہوچکی ہے جسے لیکر ابو حنیفہؒ اور شافعیؒ احمد بن حنبل اور مالک رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے اساطین علم و فضل یہ دروازہ کھولا کرتے تھے ——

—— ع اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لیکر۔

بہر تقدیر اسلام کی نظر میں اصل اطاعت اللہ اس کے رسول اور اصل مقام کتاب و سنت اور اس سے مستنبط احکام دل کا ہے۔ اگر امت کی اکثریت یا مسلمانوں کی منتخب کردہ کوئی پارلیمنٹ کسی غیر شرعی فیصلہ یا کسی گمراہی پر متفق ہو بھی جاتے تب بھی امت میں ایک مضبوط جماعت ہمیشہ ایسی پائی جائے گی جو اس "اجماع ضلالت" کی نہ صرف مخالفت بلکہ حق کی اعلان و اشاعت کرتی رہے گی۔ مجموعی امت گمراہی پر حسب بشارت نبویؐ (لا تجتمع امتی علی الضلالۃ) ہرگز متفق نہیں ہوسکتی، بنا بریں نہ تو مرکزِ ملت یا قوتِ حاکمہ کو اطاعتِ رسول سمجھا جاسکتا ہے۔ اور نہ ہم یورپ کے اسلام دشمن یہود و نصاریٰ سے درآمد شدہ نظریات کو سنت جاریہ کہہ سکتے ہیں اور نہ زنا بالرضا جیسے صریح فاحشہ کو قانونی حیثیت دینے پر اتفاق کرنے والی پارلیمنٹ کے فیصلوں کو "اجماع" قرار دیا جاسکتا ہے۔ بلکہ جسطرح دیگر دینی اصطلاحات، صلوٰۃ، صوم، حج، زکوٰۃ، قربانی وغیرہ کا ایک خاص شرعی مفہوم ہے۔ جسے نہ تو بدلا جاسکتا ہے۔ نہ ان میں "توسیع" اور ترمیم ہوسکتی ہے۔ اور جسطرح "کتاب" سے مراد وہی قرآن کریم ہوگا جسے امت اب تک متواتر آسمانی صحیفہ مانتی چلی آرہی ہے۔ اسی طرح سنت، اجماع اور اجتہاد کے وہی معانی قابلِ قبول ہوں گے جو عہدِ صحابہؓ سے لیکر اب تک متواتر چلے آرہے ہیں اور جسطرح کتاب، وحی، نبوت، رسالت وغیرہ الفاظ کے شرعی مفہومات قطعی اور اس میں تحریف و تبدیل اور ظلی بروزی کی تفریق الحاد، کفر اور زندقہ ہے، اسی طرح اسلام کے اصول اربعہ، کتاب و سنت اجماع و اجتہاد کو اپنے اصل معانی سے الگ کرنا اور انہیں اپنے من مانی معانی پہنانا تحریف فی الدین اور دین سے تلاعب اور مذاق ہی سمجھا جائے گا، جسے امت کا عمومی دینی مزاج قیامت تک برداشت نہیں کرے گا۔ واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔

سمیع الحق
۳ جمادی الاولیٰ